جناب مصطفےٰ احسن فردوسی۔ ڈھاکہ

مولانا محمد علی جوہرؒ کے ساتھ سیاسی بے انصافی

جس طرح چاند کہنے سے چاندنی کا تصوّر، پہاڑ کہنے سے بلندی کا خیال، آفتاب کہنے سے اُس کی تمازت کا احساس دل میں آنا ضروری ہے، اسی طرح انڈیا اور پاکستان کی جنگِ آزادی کا نام لیتے ہی سے چند شخصیتوں اور ان کے کارناموں کا خیال ذہن میں لازمی طور پہ آتا ہے، انہیں چند ہستیوں میں مولانا محمد علی جوہر کی ایک ہستی ہے، وہ جنگِ آزادی کے ہیرو تھے جس کے کردار کو ہٹا لینے کے بعد پوری کہانی خشک اور بے حقیقت سی ہو کر رہ جائے گی۔ اس کے باوجود بھی ان کے معاملہ میں جنگِ آزادی پر کتاب لکھنے والوں نے جو اخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت دیا ہے، وہ بڑا اثر ناک ہے۔

آزادی کی جدوجہد برّصغیر ہندوپاکستان میں جنگِ آزادی کی کہانی بڑی پرانی ہے۔ دراصل ۱۷۵۷ء ہی سے شروع ہوئی جب کہ بنگال میں انگریزوں نے سازش اور نواب سراج الدولہ کے خاص خاص معتمدوں کو غداری پر آمادہ کر کے جنگِ پلاسی میں فتح حاصل کی۔ شروع دور میں تو اجتماعی حیثیت سے عوام نے غیر منظم طور پہ ادھر ادھر چند بار کوششیں کیں، لیکن فرنگیوں کی منظم اقلیت کے سامنے بھاری اکثریت مگر غیر منظم ہندوستانیوں کی کچھ چل ہی نہ سکی، جہاں کامیابی کے امکان روشن تھے اور جہاں انگریزوں کو سخت مقابلہ کا خدشہ تھا، وہاں انہوں نے غداروں کا سہارا لیا اور ملّت فروشوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر حریت پسندوں کی کوششوں پر جبر واستبداد کی مہر لگا دی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک عرصہ تک تو خاموشی رہی۔ اس لئے کہ انگریزوں نے جس طرح قتلِ عام

کے ذریعہ عوام کو خوفزدہ کر رکھا تھا، اس کے پیشِ نظر کوئی رہنمائی کے لئے آگے آتا ہی نہیں تھا، لیکن کچھ عرصہ بعد نئے حالات اور نئے رجحانات کے ماتحت آزادی پسندوں نے کام شروع کیا اور آخرکار ایک مدت کی اکھاڑ پچھاڑ کے بعد آزادی حاصل کر کے رہے۔ اس کشاکش کے دور میں انفرادی شخصیتوں کی سیاسی سوجھ بوجھ اور ان کی مخلصانہ کوششوں نے منتشر اور شکستہ دل عوام کو منظم اور ان میں اعتماد پیدا کرنے میں بڑا کام انجام دیا۔ ایسے لوگوں کی تعداد ہندو مسلمان دونوں میں کافی رہی۔ سب کا نام آج غلط یا صحیح طور پر انڈیا پاکستان کی تاریخ جنگِ آزادی میں لیا جاتا ہے۔ لیکن صرف ایک شخصیت ایسی ہے جو اپنے بے پناہ خلوص اور خدمات کے لحاظ سے صفِ اولین میں سب سے اونچا درجہ دیئے جانے کے لائق ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا کہیں نام نہیں لیا جاتا۔ یہ ہستی مولانا محمد علی جوہر کی ہے۔

محمد علی جوہر کے ساتھ بے انصافی | مولانا محمد علی کو گذرے ہوئے آج تیس برس ہو گئے ہیں، لیکن عوام کے دلوں میں ان کا احترام ہنوز باقی ہے، اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کا احترام اور ان کی یاد عوام کے دلوں میں سینہ بہ سینہ ایک پشت سے دوسری پشت تک آتی نہ رہے، یہاں تک کہ اس وقت تک باقی رہے جب تک کہ برصغیر ہند و پاک میں ہندوستان کی آزادی کا صحیح قدرداں زندہ ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے شکستہ دل عوام کو جرأت بخشی۔ انہوں نے ان زبانوں کو جن پر ظلم و استبداد کی مہریں لگا دی گئی تھیں، دوبارہ زبان بخشی اور آہنی پہروں کو اپنے جذبہ اور حرارتِ شوق سے ہمیشہ کے لئے ختم کیا۔ لیکن افسوس کہ اس مجاہد اعظم کا تذکرہ جنگِ آزادی کی کتابوں میں نہیں کیا جاتا۔ ہم اس بے انصافی اور بددیانتی کو سیاسی اغراض، ایک سانحہ عظیم، ایک شرمناک حرکت کہنے پر حق بجانب ہوں گے۔

آزادی سے متعلق اردو، انگریزی اور ہندی سبھی زبانوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے مولانا محمد علیؒ کے سامنے سیاسی زندگی میں زانوئے ادب تہ کیا۔ اور بہت سے مصنفین ایسے ہیں جنہوں نے ان سے بولنے اور کام کرنے کا طریقہ سیکھا اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے ان کو آزادی کے کارواں سے آگے چلتے دیکھ کر پیچھے سے راہ لی لیکن اب تک جتنی کتابیں خصوصیت کے ساتھ بھارت میں لکھی گئیں وہ سب کی سب تقریباً تعصب اور بددیانتی کے ساتھ لکھی گئیں۔ ان کتابوں میں اول تو محمد علی مرحوم کا نام ہی نہیں آتا اور کہیں کہیں پر آتا بھی ہے تو اس طرح جیسے محمد علی آزادی کی جنگ میں ایک معمولی حیثیت کے مالک تھے۔ اتنی بڑی شخصیت کے ساتھ اتنی بڑی بے انصافی کیوں کی گئی۔ یہ ایک سربستہ راز معلوم ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی

.... مولانا محمد علی سے بہت کچھ استفادہ کیا ہوگا۔ انہوں نے بھی اپنی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" (INDIA WINS FREEDOM) میں کچھ تذکرہ نہیں کیا۔ صرف صفحہ نو اور دس میں مولانا محمد علی کا نام آتا ہے، وہ بھی فرنگی محل کے مولوی باری صاحب کے توسط سے آتا ہے، ورنہ محمد علی کے ناموں سے زیادہ تذکرہ حکیم اجمل خاں، لالہ لاجپت رائے، سی۔ آر۔ داس اور بپن چندرپال، وغیرہ جیسی سیکنڈ لائن آف ڈیفنس کی شخصیتوں کا ہے۔

انڈیا ونس فریڈم میں تذکرہ نہیں

"انڈیا ونس فریڈم" کا حجم ڈھائی سو صفحہ پر مشتمل ہے۔ مولانا آزاد مرحوم نے اس کتاب میں اپنی خاندانی وراثت اور بچپن سے لے کر تقریباً اپنی زندگی کے آخری پہلو تک تمام موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان موضوعات میں ایسے بھی موضوع ہیں جنہیں صحیح معنوں میں ہندوستان کی آزادی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ گھر کی باتیں ہیں جنہیں گھر ہی کے ماحول تک رہنا چاہیے تھا۔ کتاب کی تفصیل کے باوجود بھی اس میں مولانا محمد علی کی خدمات کا کہیں اعتراف نہیں ملتا، حالانکہ پنڈت نہرو نے اپنی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" (DISCOVERY OF INDIA) میں صفحہ ۳۵۲ میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ مولانا نے خلافت کی تحریک اور کانگریس پارٹی کے بنانے میں بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ مولانا کافی عرصہ تک کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے سب سے اعلیٰ رکن کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے، گاندھی جی جنہیں مولانا محمد علی جوہرؒ نے صحیح معنوں میں جنگ آزادی کے پلیٹ فارم پر لاکر انہیں مسلمانوں سے متعارف کرایا اور ان کے ارادے اور طریقہ کار میں ایک نئی جان پیدا کی۔ ان کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے اور ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ بھارت کی آزادی کی تاریخ مکمل ہی نہیں کہی جاسکتی ہے جب تک کہ گاندھی جی جیسے حریت پسند کا تذکرہ نہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ ایک منصف مزاج انسان یہی کہے گا کہ آزادی کی تاریخ بلاشبہ اس وقت تک بھی مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ جب تک کہ اس میں محمد علی جوہرؒ کی بے لوث خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔

طفیل احمد منگلوری کی طرف سے زیادتی

اسی قسم کی ۱۹۳۹ء میں ایک کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے نام سے طفیل احمد منگلوری نے لکھی۔ مولانا آزادؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسی شخصیتوں نے اس کتاب کے متعلق رائے بھی ظاہر کی اور یہ لکھا ہے کہ "مسلمانوں کو جو ملک کی سیاسی صورت حال سے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں۔ میں مشورہ دوں گا کہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں"۔ اس کتاب میں ۶۲۲ صفحے ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب "بنیادی حقوق پر ایک نظر" سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کا اختتام "بنیادی حقوق کا محاسبہ" پر ہوتا ہے۔ درمیان میں مسلمانوں کی

حکومت، ان کے اوصاف و فضائل، ان کا انحطاط، انگریزوں کا تسلط اور پھر تحریک آزادی کے تمام پہلوؤں پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ دلچسپ تو یہ ہے کہ کتاب میں خلافت کی تحریک کے عنوان سے بھی ایک علیحدہ باب ہے۔ لیکن انتہائی افسوسناک اور حیرت انگیز یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس باب میں بھی مولانا محمد علی جوہرؒ کا کوئی تذکرہ نہیں، حالانکہ یہ بات ابھی ہر خاص و عام کی زبان پر ہے کہ خلافت کی تحریک کے میر کارواں محمد علی جوہرؒ ہی رہے ہیں۔ انہوں نے اس تحریک میں جان ڈالی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو جگہ دی جا سکتی ہے، مگر ان مصنفوں کے نزدیک مولانا محمد علی کا کوئی مقام نہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مولانا آزاد نے مسلمانوں کو ملک کی سیاسی صورت حال جاننے کیلئے اس کتاب کے مطالعہ کی اہمیت تو دی ہے، لیکن کوئی رائے اس پر ظاہر نہیں کی کہ مجاہد اعظم کا تذکرہ اسکی کتاب میں نہ ہونے کے بغیر یہ کتاب معنوی لحاظ سے نامکمل ہے۔

محمد علی میدانِ عمل میں | مولانا محمد علی ۱۹۱۱ء کی کہر آلود صبح میں کلکتہ پہنچے، اس وقت وہاں ان کا کوئی جاننا پہچاننا بھی نہیں تھا، معاون تو درکنار، ارادہ یہ تھا کہ قوم خوابیدہ کو صحافت کے ذریعہ جگایا جائے، اخبار کی اشاعت کا کام بذاتِ خود ہی بڑا ہی آلام و مصائب سے بھرا ہوا کام ہے۔ اس پر یہ کہ کوئی مالی تعاون یا ہمت افزائی کرنے والا نہیں۔ اسی وقت انہیں ایک طویل ٹیلیگرام ملا جس میں کہ ایک ریاست کے وزیر اعلیٰ ہونے کی سرکاری دعوت دی گئی تھی۔ اس سے قبل بھی انہیں کئی بار ریاست کے وزیر اعلیٰ بننے کی دعوت دی جا چکی تھی جسے انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔

ریاستی زندگی کے حکمران یا حاکم اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے جو ٹھاٹھ اس وقت لوگ کیا کرتے اس کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آج کا وزیر اعظم بھی ویسے افراط زر اور آسائش کی زندگی نہیں گذار سکتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود مولانا محمد علی نے اس ٹیلیگرام کو اس وقت تک نہ کھولا جب تک کہ ان کا مرید اخبار ۱۱ر جنوری ۱۹۱۱ء کو شائع نہ ہو چکا مبادا کہ ٹیلیگرام کے اندر بڑی اور بھرپور دعوت ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ لا دے۔ وہ قومی خدمت کی عسرت کی زندگی کو بہترین تو فعاتی اور افراط زر کی زندگی پہ ترجیح دیتے تھے۔

ان کے ہم عصر جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں میں بھی زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی تھی جو روزمرہ کی زندگی میں آرام و آسائش کی زندگی کو پسند کرتے تھے اور ان کے بعد بھی زیادہ تر ایسے ہی لوگ پلیٹ فارم پہ آئے جن کا رہن سہن عوام کے رہن سہن سے بالکل مختلف تھا۔ برخلاف اسکے

محمد علی جوہرؔ مرحوم کی زندگی سادہ تھی۔ یہاں تک کہ وہ ہزاروں کے مجمع میں کھڑے تو پھر بغیر صورت سے پہچانے ہوئے انہیں لباس سے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا، کہ وہی شخص ہے جس کی ایماء پر مسلمان اپنا مال اور اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار رہتے۔

ایچ۔ جی۔ ویلیس کا خراجِ تحسین | انگریزی کا مشہور و معروف مصنف ایچ۔ جی۔ ویلیس مولانا محمد علی کی عظمت ان جملوں میں پیش کرتا ہے:۔

HE HAD THE HEART OF NEPOLEAN, PEN OF MACAULAY AND TOUNG OF BREEK.

وہ نپولین کا دل، میکالے کا قلم اور برک کی زبان رکھتے تھے۔

ان تینوں شخصیتوں سے تعارف رکھنے والے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایچ۔ جی۔ ویلیس کس حد تک مولانا محمد علی کی اعلیٰ صلاحیتوں اور بے پناہ ہمت و جرأت کا معترف ہے، کسی انگریز مصنف نے برصغیر ہند و پاک کی شخصیتوں میں سے اتنا بڑا خراجِ تحسین کسی کو پیش نہیں کیا۔

عوام ہمیشہ محمد علی کو یاد کریں گے۔ | اب جہاں تک ان کی سیاسی و قومی خدمات کا تعلق کا مرثیہ کے قائل۔ مولانا محمد علی کی تقریریں اور ان کی تحریریں جو منتشر اوراق میں پھیلی ہوئی ہیں، وہ آنے والی نسلوں کو بتا سکتی ہیں کہ مولانا محمد علی کی شخصیت ایک جنگِ آزادی کے مجاہد کی حیثیت سے کتنی بلند اور ارفع تھی۔ وہ لوگ جنہوں نے آپ کو قوم کے خادم کی حیثیت سے پروانہ وار کام کرتے دیکھا ہے، گو آج خال خال ہیں، لیکن پھر بھی جو باقی ہیں وہ ان کی یاد میں ہنوز قوم کی خاطر سرفروشی کے سنتے تازہ دم ہو جاتے تھے۔

غیر ممالک میں محمد علی نے ہندوستان کا تعارف کرایا۔ | ۱۹۲۵ء کے بعد انگلینڈ، امریکہ اور دیگر یورپین ممالک میں جس نے مورخوں، ناقدوں، ادیبوں، سیاست دانوں، مقرروں اور عوام الناس کو یہ بتایا کہ ۱۵۰۰ میل لمبی اور ۲۰۰۰ میل چوڑی سرزمین، ہندوستان میں صرف گھاس پھوس نہیں بلکہ آزادی کے خواہاں انسان بستے ہیں۔ وہ دراصل مولانا محمد علی جوہرؔ کی ذات تھی، ورنہ مسٹر گاندھی ہو یا سی۔ آر۔ داس یا مولانا ابو الکلام آزاد، کسی کی بھی شخصیت ایسی نہیں تھی جس نے ہندوستان کی آزادی کے نظریہ کو اتنے واضح طور پر اور اس بے باکی سے پیش کیا تھا۔

ہمت و جرأت کی بے پایاں مثال | کراچی میں مولانا محمد علی کے خلاف غداری کا مقدمہ چلایا گیا۔ یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا، اس مقدمہ کی روئیداد جنہوں نے پڑھی یا سنی ہے، انہیں بخوبی معلوم ہے کہ ا

شخص کا دل ملک وملت کے لئے وقف الم تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے جب آزادی کی کوشش کو بار آور ہوتے نہیں دیکھا تو انہوں نے اپنی زبان سے اللہ کے راستہ میں لوٹ آنے کی دعا کی جو مستجاب ہوئی ہے

اکسیر یہی ایک دعا میرے لئے ہے اللہ ہی کے رستہ میں جو موت آئے تو اچھا

بیس سال کی مستقل جدوجہد اور پریشانی کے بعد چوتھی بار مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ نومبر ۱۹۲۰ء کی بات تھی۔ اس وقت آپ کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی۔ ڈاکٹر مسلسل انہیں آرام کے لئے تاکید کر رہے تھے۔ عزیز واقارب، دوست احباب جتنے تھے سبھوں نے لندن کے سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن آپ نے جواب یہ دیا کہ مجھے تین دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ ۱۔ ذیابیطس، اس سے نمٹ لوں گا۔ ۲۔ حکومت برطانیہ، تو اس سے بخوبی لڑوں گا۔ ۳۔ صرف ایک دشمن ہے، جس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور وہ موت ہے۔ آپ نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ شدید بیماریوں کے بعد بھی آپ لندن پہنچے اور سینٹ جیمس پیلس میں "آزادی یا موت" کے عنوان سے ایک یادگار تقریر کی، جو آج بھی شائقین انگریزی کو یاد ہوگی۔ اس تقریر کا ہر جملہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ آزادی کی جنگ میں مولانا محمد علی کا مقام گاندھی، پنڈت نہرو، ڈاکٹر مونجے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے کہیں بلند تر تھا۔ اس لئے کہ آپ ہندوستان کی مکمل آزادی کے خواہاں تھے جب کہ گاندھی جی سے لیکر تمام کانگریسی ممبران اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ ہندوستان ڈومینین اسٹیٹس ہی مل جائے۔ آپ کی اس آخری تقریر کے چند جملے یہاں درج کئے جاتے ہیں، جس سے قارئین کو ان کی جرائت اور ہمت مردانہ کا اندازہ ہو۔

"مسٹر چیرمین، ہندوستان میں ہم ۳۲ کروڑ کی تعداد میں ہیں، جبکہ ہم لاکھوں لاکھ کی تعداد میں وباء اور قحط میں مر سکتے ہیں، تو بلاشبہ ہم برطانیہ کی گولیوں کو سینوں پر برداشت کرنے کی جرائت کر سکتے ہیں۔ دنیا میں آج تک کوئی جنگ صرف مارنے کے حوصلے سے نہیں لڑی گئی بلکہ میدان جنگ جیتنے کیلئے مرنے کا بھی حوصلہ رکھتا ہو۔ ہم ہندوستانیوں نے مرنے کا بھی حوصلہ پیدا کیا ہے اور یہ سمجھ لو کہ ۳۲ کروڑ انسان کو گولی کا نشانہ بنانے کی ہمت تم میں نہیں آسکتی۔ کیا تم ۳۲ کروڑ انسانوں کے ہلاک کر دینے کی کوئی مشین بنا سکتے ہو، اگر بنا بھی لو تو تمہارے اندر وہ حوصلے ہیں۔؟

میں اسی وقت یہاں سے جا سکتا ہوں، جب کہ مجھے آزادی مل جائے ورنہ

میں ایک غلام ملک میں واپس جانا نہیں چاہتا۔ وطن سے دور غیر ملک میں ہی مرنا پسند کروں گا جب تک کہ یہ ملک آزاد ہے اور اگر تم مجھے آزادی نہ دے سکے تو تمہیں مجھے قبر دینی ہوگی۔"

یہ ان کی تڑپتی ہوئی تقریروں کے چند جملے تھے جو ترجمہ کرکے پیش کر دیئے گئے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہی ان کی بے لوث خدمات اور بے پناہ جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ شاید اتنی جرأت آج تک انڈیا پاکستان کے کسی بھی لیڈر میں نہ آسکی جو لندن میں جاکر تاج برطانیہ کے سامنے آزادی کی خاطر للکارے۔

سید سلیمان ندوی کا خراج تحسین | مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے قلم سے ان کے انتقال کے بعد خراج عقیدت پیش کیا وہ بھی دیکھنے یا سننے کے لائق ہے۔

"افسوس پرورد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ پر صدائے شور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی۔ وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہو جاتا تھا، اور اوروں کو بیتاب کرتا تھا ذرا دیکھا کہ قیامت تک کیلئے ساکن ہوگیا۔ وہ اشکبار آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرتاکہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی۔

تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو۔ تو ملت اسلامیہ کا سوگوار تھا، فرض ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے تو دنیائے اسلام کا ماتم کناں تھا، سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے۔ ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کیلئے غمزدہ، بلقان کے لئے اشکبار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختہ غم اور بیت المقدس کے لئے وقف الم ---- اے بندۂ آوارہ گرد مسافر! تیرا حق سرزمین اسلامیہ کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لئے اولین قبلہ اسلام کا سینہ پھٹ جاتے اور تو اس میں سما جاتا۔"

محمد علی جوہر سے مولانا مرحوم کی ملاقات سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں الہلال کے دفتر کلکتہ میں ہوئی۔ اس وقت کامریڈ کو نکلے گرچہ صرف دو سال ہوئے تھے، لیکن ان دو سال میں کامریڈ کی آواز کلکتہ اور دہلی سے نکل کر شملہ پہاڑ ایوں ٹکرا رہی تھی، اور دنیا کا چپہ چپہ مولانا محمد علی کی پکار سن چکا تھا۔

آج لیڈروں نے ان سے عمل کا طریقہ سیکھا۔ مولانا محمد علی دہلی میں کوچہ چیلاں میں مقیم تھے۔ ان کی رہائش گاہ اس وقت سیاسیات کا مرکز تھا جہاں گاندھی جی سے لیکر ہندوستان کا ہر چھوٹا اور بڑا لیڈر آتا اور ان کی قیامگاہ کے صحن میں بیٹھ کر سیاست کی چال سمجھتا، سیاست کی زبان سیکھتا اور جرائتِ رندانہ کا سبق حاصل کرتا۔ محفل بارونق ہوا کرتی اور درجنوں حضرات مولانا مرحوم سے بات چیت کرتے رہتے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے کوئی بھی مصنف اگر وسعتِ قلب و نظر رکھنے کے سبب فراموش تو کر سکتا ہے۔ لیکن جھٹلا نہیں سکتا۔

دیوان سنگھ مفتون کا خراج تحسین مولانا محمد علی کانگریس کے صدر بھی رہے۔ بقول پنڈت نہرو "انہوں نے کانگریس کو نئی روح اور ہمت بخشی، لیکن پھر بھی کانگریس سے علیحدہ محاذ بنانے کی ضرورت کیوں محسوس کی، یہ ایک علیحدہ موضوع بحث ہے جس کی طوالت میں پڑنا میرا یہاں پر کام نہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے ہندو معتقدین میں سے ایک شخص جناب دیوان سنگھ مفتون نے اپنی تحریر میں یہ اعتراف کیا ہے کہ "مولانا نے کانگریس سے علیحدگی کانگریس کے لیڈروں کی حماقتوں کی وجہ سے اختیار کی، مردم ناشناسی اور بے قدری کے باعث کانگریس مولانا جیسی بے ریا۔ لائق اور بلند شخصیت سے محروم ہو گئی۔ اور یقیناً یہ ہندوستان کی بدنصیبی تھی کہ لارڈ اردن سے ملنے کے لئے جب پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر پٹیل وغیرہ کا ڈیپوٹیشن تیار ہوا تو ان لیڈروں نے مولانا کو پوچھا تک نہیں تھا۔"

دیوان سنگھ مفتون نے جو جائزہ لیا وہ ان کا اپنا نظریہ ہے ورنہ دراصل بات یہ تھی کہ ۱۹۱۱ء میں جب بنگال کی سابق تقسیم کو ختم کر کے متحدہ بنگال کر دیا گیا، اسی وقت مولانا کو برطانیہ اور ہندوؤں کے ساتھ اعتماد نہ رہا۔ اور جوں جوں وقت گذرتا گیا اور آزادی کی تحریک کے اثرات جڑ پکڑنے لگے، مولانا مرحوم کو روز روشن کی طرح عیاں ہوتا گیا کہ کانگریس کا نیشنلسٹ نعرہ ایک سیاسی فریب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ بلکہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے، جس میں مسلمانوں کے لئے کوئی فلاح نہیں، لہذا انہوں نے اپنا لائحہ عمل اسی وقت بدل دیا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے کانگریس ہی کو مسلمانوں کے لئے نجات دہندہ پارٹی سمجھ کر اس میں شریک رہے۔

مولانا محمد علی مرحوم کی ذات کیساتھ چنانچہ کتابوں میں جو بددیانتی برتی گئی وہ اس سیاسی اختلاف کے باعث ہوئی اور دوسری وجہ ان کی جانب سے قصداً اور عمداً بے توجہی سے پیش آنے کی یہ بھی جا سکتی ہے کہ چونکہ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت اتنی بلند تھی کہ اگر ان کا تذکرہ دیانتداری سے کیا جاتا تو دوسرے رہبرانِ راہِ آزادی کا کوئی شمار نہیں ہوتا۔ ■■